معاصر اردو تنقید کا منظر نامہ

[1] ڈاکٹر انوار احمد

Abstract
In this paper contemporary horizon of Urdu literary criticism has been viewed by a teacher who has been teaching criticism in different universities over a period of 4 decades. Though in these days we are focusing on the relationship of linguistics and criticism and theories of criticism yet this article has a view point inviting other perceptions to differ. We will welcome those dissenting views as well.

کلیدی الفاظ: تنقید، اردو تنقید، فکشن، شاعری

آج سے تین عشرے پہلے معاصر اُردو تنقید کے بارے میں بات کرنا بہت آسان تھا، ہم شعرائے اُردو کے تذکروں کے بعد حالی، شبلی اور آزاد کی بات کر کے سیدھے کلیم الدین احمد، احتشام حسین اور محمد حسن عسکری پر آجاتے تھے اور اُن کے اُٹھائے ہوئے سوالوں پر بات کرتے کرتے ادبی رسائل کے چند مدیروں تک پہنچتے، کچھ درس گاہوں کے اساتذہ کا ذکر کرتے، ڈاکٹر سید عبداللہ، سید وقار عظیم، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی طالب علموں میں مقبول کتابوں کے بعد ڈاکٹر عبادت بریلوی کی کتاب 'اُردو تنقید کا ارتقا' تک پہنچ جاتے، تب پانچ باتیں طے شدہ لگتی تھیں:

الف:۔ اُردو میں تنقید کا آغاز سرسید تحریک سے ہوا، حالی، شبلی اور آزاد کے امتیازات یا اختلافات کے باوجود اُنکی پذیرائی انگریز حکام نے زیادہ تر مستشرقین کے روپ میں کی، جو ظاہر ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار کو مستحکم اور دیرپا بنانا چاہتے تھے۔

ب:۔ برصغیر میں بیسویں صدی کے طلوع ہوتے ہی مزاحمت میں بعض ہزیمتوں کے باوجود تحریکِ آزادی تیز تر ہوئی تو یہ کروڑوں محنت کشوں کے لیے غربت جہالت اور غلامی کی تذلیل کو قبول نہ کرنے والوں کا جذباتی اور فکری سہارا ترقی پسند ادبی تحریک بنی، جس نے صدائے حریت کو بلند آہنگ بنایا اور مختلف

---

[1] سابق صدر نشیں، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

ذاتوں، عقیدوں اور نسلوں میں بٹے ہندی غلاموں کے لیے اجتماعی خود شناسی کا ذریعہ بن گئی، وہی تحریک جس کا نقطہ آغاز ہی پریم چند کا خطبہ صدارت بن گیا، جو عمرانی تنقید کی نئی دستاویز کا درجہ اختیار کر گیا، جس سے احتشام حسین، مجنوں گورکھ پوری، ممتاز حسین اور پھر ڈاکٹر محمد علی صدیقی طلوع ہوئے۔

ج:۔ اس تحریک کے مقابل جمالیات پسند، ہیئت پسند، زوال پسند نے آستانہ عسکریہ میں پناہ لی مگر محمد حسن عسکری ایک غیر معمولی پہلودار شخصیت کے مالک تھے تاہم وہ اپنے بیشتر پیروکاروں اور شارحین کی سمجھ میں نہ آسکے۔

د:۔ اُردو تنقید میں نمایاں مقام بنانے والے نقاد وہی تھے جو انگریزی ادبیات کے استاد تھے اُن کے مقابلے پہ سید عبداللہ، سید وقار عظیم اور عبادت بریلوی دور سے پہچانے جاتے تھے حتیٰ کہ میر انیس کی مرثیہ نگاری اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ، ادبی تخلیق اور فریبِ نظر جیسی کتابوں کے مصنف ڈاکٹر احسن محمد فاروقی بھی انگریزی ادبیات کے استاد تھے جنھوں نے مدرس نقاد، منشی نقاد اور درزی نقاد (جو قینچی کا اچھا استعمال کر سکتا ہو) جیسی ناقدین کی قسمیں بتا کر اردو تنقیدی روایت کی تضحیک کرنے والوں کی اسی طرح مدد کی، جیسے کبھی کلیم الدین احمد کی اردو تنقید پر ایک نظر کے دیباچے نے کی تھی، حال آں کہ ڈاکٹر احسن فاروقی نے 'اردو میں تنقید' جیسی متوازن کتاب لکھی۔

ہ:۔ ادبی جرائد کے بعض مدیروں کو نظریہ ساز نقاد بننے کا شوق چرایا جیسے 'فنون' کے احمد ندیم قاسمی اور 'اوراق' کے ڈاکٹر وزیر آغا اور 'شب خون' کے ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی، ان مدیروں نے بعض تخلیق کاروں کی فطری تخلیقی قوت کا دھارا بھی بدلنے کی کوشش کی، جیسے ڈاکٹر وزیر آغا نے مجید امجد کو ماورائیت اور ابہام کی الفت میں پختہ کیا، یا جیسے شمس الرحمن فاروقی کی ایسی کاوشوں پر سریندر پرکاش نے اپنے افسانوی مجموعے میں بلند آہنگ احتجاج کیا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جب نوآبادیات میں استعمار کے سائے سمٹنے کا امکان پیدا ہوا تو ہند مسلم کلچر، تاریخ اور اردو شعر و ادب کی روایت تصادم اور آویزش کی طرف بڑھنے لگی، شاید اسی کے رد عمل میں محمد حسن عسکری نے اُردو زبان میں مرکزی دینی روایت کے احساس کا سوال اُٹھایا، جو قیام پاکستان کے بعد مسلمان

ملکوں کو اشتراکیت سے بچانے کی امریکی کاوشوں کے تناظر میں ایک اور طرح سے سمجھا اور سمجھایا گیا، پنڈی سازش کیس کا نشانہ بننے والے پی پی ایل سے وابستہ اہل قلم کے ساتھ ایک طرح کی فکری آویزش کا آغاز ہو گیا، مذہبی جماعتوں کے زیر اثر اخبار اور اہل قلم تو دو چار قدم اور آگے بڑھ کر ترقی پسند ادیبوں کی جلاوطنی، مواخذے اور معاشی قتل کا مطالبہ کرنے لگے۔ یہ اور بات ہے کہ محمد حسن عسکری سمجھتے تھے کہ فکری اختلاف کا مطلب اپنے مخالفین یا حریفوں کو جیلوں میں بھیجنا یا بے روزگار کرنا نہیں۔ محمد حسن عسکری تہہ دار شخصیت کے مالک تھے ان کا فکری اضطراب انھیں مولانا اشرف علی تھانوی، مفتی محمد شفیع، اکوڑہ خٹک کے مولانا عبدالحق اور فرانسسی مفکر رینے گینوں [جو مسلمان ہو کر عبدالواحد ہو گئے] کے قریب لے گیا، مگر عسکری کے پُرجوش مقلدین کے برعکس ڈاکٹر سُہیل احمد خان اور ایک دو متوازن ناقدین نے ان سے اخذ فیض کیا لیکن اس بات پر پردہ نہیں ڈالا کہ وہ سلیم احمد کے امریکیوں سے روابط یا بھٹو کی پھانسی کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے۔ اکوڑہ خٹک کی مذہبی درسگاہ کے لیے جدیدیت یا مغربی گمراہی کے خدوخال جیسی نصابی کتاب لکھنے کے باوجود چینی موسیقی، فرانسیسی ادب اور اُردو زبان میں بلاغت کے امکانات بڑھانے کی آرزومندی ان کے وہ عجیب وغریب ذہنی مشاغل تھے جو ان کے یک رخے پیروکار نہ سمجھ سکے۔ مگر یہیں مناسب ہو گا کہ ذرا رک کے اردو ادب کی 'کفر پرستی' کے حوالے سے ڈاکٹر آفتاب احمد کی نکتہ شناسی پر بھی غور کیا جائے:۔

> ''مسلمان ادیبوں کی ایک امتیازی خصوصیت ان کی ''کفر پرستی'' بھی ہے۔ مسلمانوں کے ادب میں جس شدت اور جس تاکید سے کفر کو بطور ایک اخلاقی اور روحانی دستور حیات کے پیش کیا گیا ہے اور جس کفر کا کلمہ پڑھا گیا ہے اس کی مثال کسی اور قوم کے ادب میں نہیں ملے گی۔ اس قسم کی کفر پرستی کی روایت خاص مسلمان ادیبوں کی چیز ہے جو صدیوں ایک تسلسل کے ساتھ قائم رہی ہے۔ بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں ظاہر پرستوں اور روحانیت سے لگاؤ رکھنے والوں، یعنی زاہدوں اور صوفیوں کی باہمی کشاکش ہمیشہ سے چلی آئی ہے۔ صوفیوں کا کفر ''خلاف مذہب آناں'' کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ زاہدوں کی تنگ دلی اور ظاہر پرستی کا جواب ہے، اسلام سے انکار یا بغاوت نہیں، ان کفر پرست صوفیوں، شاعروں اور ادیبوں میں سے شاید ایک بھی ایسا نہیں جو اسلام کا منکر اور باغی ہو، کفر ان کے ہاں رچی ہوئی بھرپور زندگی کی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ یعنی اس

زندگی کی علامت کے طور پر جس سے زاہدوں کی ظاہر پرستی محروم ہے، جس میں روح کی حکمرانی ہے، خیال کی آزادی ہے، جس کا کیش ترک رسوم اور جس کا مشرب رواداری ہے، جس کی فضا میں وسعت اور تجربات میں گہرائی اور خلوص ہے۔ جذب وشوق اور سوز وساز ہے، مختصر یہ کہ جس کا مسلک زندگی کی بے اندازہ صلاحیتوں اور امکانات کو دم بخود کرنے کی بجائے ان کو پیغام دیتا ہے، جو اعلیٰ اخلاقی اور روحانی اقدار کی تلاش ہے اور ان کا اثبات بھی۔''(۱)

بے شک ہمارے پاس شبلی کی روایت میں مشرقی انتقاد کے فنی وسائل پر زور دینے والے سید عابد علی عابد جیسے نقاد تھے جنھوں نے بیان اور بدیع کے بارے میں کتابوں کے ساتھ اصول انتقاد ادبیات جیسی کتابیں لکھیں، جو تحسینِ شعر کے مشرقی معیارات کو سامنے لاتی ہیں، سبھی جانتے ہیں کہ تخلیق کے برعکس تنقید کا مدرسے سے ناگزیر تعلق ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ پاکستانی جامعات کے اردو شعبوں میں سید عبداللہ، فرمان فتح پوری، غلام مصطفی خان یا خلیل صدیقی جیسے استاد نہ رہے تو پھر مظفر علی سید کا یہ شکوہ بے جا محسوس نہیں ہوتا:

''آج جب ہمیں نوجوان شاعروں کے کلام میں جب کوئی ٹکڑا آہنگ شعر سے اکھڑا ہوا سنائی دیتا ہے تو خفا ہونے سے پہلے ہمیں اپنے آپ سے یہ سوال ضرور کرنا چاہیے کہ ہماری رسمی یا غیر رسمی تعلیم نے کسی نوجوان کو آہنگِ شعر سے آشنا ہونے کے کتنے مواقع فراہم کیے ہیں؟ عروض کی تعلیم اور شعر خوانی کی تربیت نہ صرف یہ کہ ہمارے مدارس میں نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے بلکہ ادب پڑھانے والوں کی شان میں گستاخی نہ ہو تو یہ کہنا کچھ ایسا غلط نہ ہو گا کہ یونیورسٹی کی سطح پر کم ہی کوئی استاد میر، غالب اور اقبال تک کے مشہور اشعار کو کسی تقدیم وتاخیر یا تغیر وتبدل کے بغیر سنا سکتا ہے۔''(۲)

صرف یہ اردو شعبوں پر چھائے زوال کا ماجرا نہیں، اردو تنقید کو فکری کمک فراہم کرنے والے انگریزی شعبوں میں ادبیات کی تدریس ثانوی حیثیت اختیار کر گئے اور ان کی جگہ لسانیات راج کرنے لگی، اس طرح وہ تاریخی اور تنقیدی شعور جو معاشرے کے ساتھ ساتھ شعر وادب کے قارئین کی تربیت کرتا تھا اور جس سے حالات کو جوں کا توں رکھنے کی خواہاں قوتیں خائف ہوتی تھیں، وہ کم وبیش نابود ہو گئیں اور ان کی جگہ تخلیقی دنیا کو اور زیادہ پیچیدہ اور مبہم کرنے والی ایک جناتی زبان نے لے لی اور تنقید ادبی قاری کی تربیت کے فریضے سے

یکسر دست کش ہو گئی، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے بعد اب سید رضی عابدی [تین ناول نگار، اچھوتوں کا ادب]، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، ڈاکٹر قاضی عابد، ڈاکٹر عامر سہیل انھی نیم مقفل درسگاہوں کے استاد ہیں۔

نقاد کو زندگی کے تغیرات ہراساں نہیں کرتے کہ وہ ذوقِ ادب کے ساتھ فلسفہ یا تاریخ کو اپنی بنیادی قوت بنا کر ان کے محرکات کا تجزیہ کرتا ہے اور ادبی کائنات کے تغیرات پر بھی نظر رکھتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ٹیکنالوجی کے فروغ کے ساتھ آنے والی تیز رفتار اور دور رس تبدیلیوں پر بھی نظر رکھتا ہے اور جانتا ہے کہ صارفیت کے کلچر میں 'فکری صارفیت' کا مفہوم کیا ہے اور عالمی ساہوکار مقروض ملکوں کی اس دانش سے خوف زدہ کیسے رہتے ہیں، جو بیرونی امدادی اداروں کے استحصال کے نئے ہتھکنڈوں کو محنت سے جو دل کش غلاف اور نقاب چڑھاتے ہیں ان کے اتر جانے سے خائف رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر جعفر احمد اور احمد سلیم ایسے چند نقاد ہیں۔

مثال کے طور پر ڈاکٹر محمد علی صدیقی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''آج دنیا میں جس نوع کے گلوبلائزیشن کا چرچا ہے، وہ دراصل بنیادی تصادم ہے گلوبلائزیشن یعنی فزوں تر سرمایہ اور فزوں تر غربت کے مابین۔''(۳)

اسی طرح وہ ثقافت کے بارے میں ترقی پسندانہ موقف رکھتے ہیں، یعنی ماضی کو مکمل مسترد کرنے کے حق میں نہیں، وہ لکھتے ہیں:۔

> ''ثقافت مجموعہ ہے تاریخی تسلسل کی تاریخ اخذ و اکتساب اور استرداد کا، صرف استرداد کی روئیداد سے کام نہیں چلے گا، ہمیں یہ حقیقت بھی تسلیم کرنی ہے کہ ہمارے حال میں کتنا ماضی پوشیدہ ہے اور کتنا مستقبل؟''(۴)

ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے برعکس ڈاکٹر سہیل احمد خان نے داستان، اجتماعی لاشعور، علامت سازی اور اساطیر پر کام کیا، مگر وہ اجتماعی زندگی کا تنقیدی شعور بھی رکھتے تھے، وہ لکھتے ہیں:

> ''نئے ادب میں عموماً ہوا یہ ہے کہ قدیم علامتیں الٹ گئی ہیں۔ زینہ بلندی کی طرف نہیں لے جاتا، پل راستے میں ٹوٹ جاتے ہیں۔ مذہبی اور اساطیری کردار اپنی قوت کھوئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سلیماں سربزانو ہے اور سباویراں۔ انسان جانور بن جاتا ہے۔ بھول

بھلیوں سے نکلنے کا رستہ نہیں ملتا۔ سواریاں منزل تک نہیں پہنچیں اور زندگی کا شجر ٹنڈ منڈ درخت بن گیا ہے۔ یہ صورت حال بھی نئی تو نہیں قدیم علامتوں ہی کی ایک معکوس شکل ہے جس کا ادراک خود قدیم حکمت میں بھی کیا گیا ہے۔ انسان کو جانور نئے افسانہ نگاروں نے تو نہیں بنایا۔ وہ قدیم کہانیوں ہی کا ایک مرحلہ ہی تو ہے۔ بھول بھلیوں میں پھنسنا بھی خود انہی کہانیوں ہی کا ایک مرحلہ ہے۔ پل سے لڑھک جانے کا منظر وہاں بھی ہے مگر وہاں انسان گر کر سنبھل جاتا ہے اور ان عبوری مراحل سے نکل آتا ہے۔''**(۵)**

بہت عرصے تک یہ گمان رہا کہ پاکستان میں تخلیق کا معیار بہتر ہے مگر آزادی خیال، جمہوریت کے تسلسل اور سیکولرازم کے ساتھ کثیر اللسانی اور کثیر الثقافتی سماج کے سبب بھارت میں اُردو تنقید پاکستان سے بہتر ہے جہاں بار بار مردانِ آہن، طلبگارانِ علم و دانش کے لیے لوہے کی ٹوپیاں لے کے آجاتے ہیں مگر ہم پاکستانیوں کو بے پناہ خوشی ہے کہ بھارت میں بھی ہندو طالبان کے سبب ان کی فکری برتری اور تنقیدی شعور کا بھرم کھل گیا ہے۔ تاہم وہاں ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، قرۃ العین حیدر، ڈاکٹر شمیم حنفی توازن کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ڈاکٹر شمیم حنفی کی تنقید کا ایک نمونہ دیکھئے:

''بیسویں صدی تاریخ کی سب سے زیادہ پُر تشدد صدی تھی۔ اکیسویں صدی کے شانوں پر اسی روایت کا بوجھ ہے۔ جسمانی تشدد سے قطع نظر، بیسویں صدی نے انسان کو تشدد کے نت نئے راستوں پر لگا دیا۔ تہذیبی، لسانی، سیاسی، جذباتی تشدد کے کیسے کیسے مظہر اس صدی کی تہہ سے نمودار ہوئے۔ حد تو یہ ہے کہ اس صدی کی اجتماعی زندگی کے عام اسالیب تک تشدد کی گرفت سے نہ بچ سکے۔ اس عہد کی رفتار، اس کی آواز، اس کے آہنگ اور فکر، ہر سطح پر تشدد کے آثار نمایاں ہیں۔ میلان کنڈیرا کا خیال ہے کہ یہ صدی دھیمے پن (Slowness) کا جادو، سرے سے گنوا بیٹھی ہے۔ آرٹ اور ادب کا انکھوا خاموشی اور تنہائی اور دھیمے پن کی شاخِ زریں سے پھوٹتا ہے اور ہر بڑی تخلیقی روایت کا ظہور فن کارانہ ضبط اور ٹھہراؤ اور تحمل کی تہہ سے ہوتا ہے۔ ایک بے قابو اور بے لگام معاشرے میں جو اپنی رفتار، اپنی آواز، اپنے اعصاب اور حواس کو سنبھالنے کی طاقت سے محروم ہو چکا ہو، آرٹ اور ادب ایک طرح کے دفاعی مورچے کی حیثیت رکھتے ہیں۔''**(۶)**

''دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح ہندوستان اور پاکستان کی زبانوں کے ادیب اور دونوں

ملکوں کے دانشور، ان سوالوں میں وقتاً فوقتاً الجھے رہتے ہیں۔ دوسری طرف ان میں اقتدار کی پوجا کرنے والے اور مشکوک کردار رکھنے والے افراد بھی ہیں جو کسی نہ کسی بہانے اپنے راستے نکال لیتے ہیں۔ ابھی چند روز قبل وزیر اعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ نے کہا تھا کہ کلچر کی سرپرستی کے لیے کارپوریٹ ہاؤسز کو آگے آنا چاہیے۔ بجا اور درست۔ مگر اس کلچر کی ماہیت کا تعین کون کرے گا؟ اسے ڈیفائن (define) کن بنیادوں پر کیا جائے گا؟ آرٹ اور ادب کے اداروں کی باگ ڈور کن ہاتھوں میں ہو گی؟۔۔۔ یہاں میرا دھیان مجھے ایک ضمنی حوالے کی طرف لے جاتا ہے۔ انیسویں صدی کی انجمن اشاعت علوم مفیدہ (انجمن پنجاب) کا دائرہ کار جن لوگوں نے وضع کیا تھا ان میں صرف ادیب، شاعر، عالم اور دانشور نہیں تھے۔ ان میں کچھ برطانوی حکام بھی پیش پیش تھے اور انجمن کا منشور ان کی احتیاج اور ترجیحوں کے مطابق ترتیب دیا گیا تھا۔ (آرٹ، ادب اور ایک پرامن دنیا کی تلاش (سوچ لینے ہی سے حالات کی زنجیر کہاں کٹتی ہے)۔''**(۷)**

نئی لٹریری تھیوری نے لسانیات اور لسانی مباحث کو تنقید کا ناگزیر حصہ بنا دیا، فلسفہ، نفسیات، بشریات، اساطیر اور ثقافت خاص طور پر زیر بحث آنے لگے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے امریکن یونیورسٹی کے لیے جب کام کیا تو ان کی بنیادی کتاب پاکستان جامعات میں بھی زیر بحث آنے لگی ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے زیادہ تر اپنے ماخذات کے حوالے دیے لیکن ممکن ہے کہ بعض جگہ وہ ایسا نہ کر سکے ہوں تو اس بات کو بعض لوگوں نے اُچھالا بھی ہے۔ اس حوالے سے نوجوان نقاد ڈاکٹر عباس نیئر نے تواتر سے کام کیا ہے، ایک طرف تو انھوں نے نئی لٹریری تھیوری کی فکری اساس، اصطلاحات اور پھر اطلاقات پر بہت عمدہ کام کیا ہے، یہی نہیں انھوں نے اردو ادب کی تشکیل نو اور مابعد نوآبادیاتی تناظر میں اہم مباحث چھیڑے ہیں، ان کی فکری تربیت ڈاکٹر وزیر آغا اور پنجاب یونیورسٹی نے کی ہے تاہم یہ خوش آئند ہے کہ وہ پس جدیدیت دور کا ذکر ہو یا دیگر اطلاقات مارکسی، عمرانی اور ترقی پسند تنقید کے لیے 'مطعونیت' کے عمومی رویے کے مقابل کسی قدر ہمدردی کا رویہ رکھنے لگے ہیں، تاہم وہ مقدمہ شعر و شاعری کے مقابل خواجہ امداد امام اثر کی کاشف الحقائق کو جب اہمیت دیتے ہیں تو ان کی ہم نوائی مشکل ہو جاتی ہے، یہاں ڈاکٹر قاضی عابد کا بھی ذکر کرنا چاہیے جنھوں نے بہت کم وقت میں تانیثیت، مابعد نوآبادیات اور اساطیر پر بہت اہم کام کیا۔ ان کی تنقید کی ایک مثال دیکھیے:

قصص ہند (حصہ دوم) بھی بنیادی طور پر تو تاریخ کی کتاب ہے لیکن اسے اُردو کے ایک بے حد اہم ادیب نے نصابی ضرورتوں کے تحت تالیف کیا۔ نور تاریخیت اسے بھی ایک ادبی متن کے طور پر دیکھنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ یہاں پر اس کتاب کی نوعیت اور اس کے پیچھے موجود آئیڈیالوجی کو سمجھنے کے لیے ان نکات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔

۱۔ یہ کتاب تاریخ کو زمانی تسلسل میں دیکھنے کی بجائے تاریخ کے کچھ منتخب کرداروں/ادوار کا احاطہ کرتی ہے۔

۲۔ یہ کتاب نصاب کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے نوآبادیاتی ہندوستان میں لکھوائی گئی۔

۳۔ مولانا محمد حسین آزاد ایک راسخ العقیدہ اثنا عشری تھے۔

۴۔ وہ شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر نوآبادیاتی مقاصد کو پورا کر رہے تھے۔

۵۔ ان کے ذہن میں اپنی تہذیب و ثقافت سے اٹوٹ محبت کے باوجود Hybridity کا راسخ عقیدہ بھی اُبھر رہا تھا۔

۶۔ وہ ابھی دو قومی نظریات کے تشکیلِ عمل سے دور ہندوستان اور پاکستان میں ایک خاص وضع کی تاریخ نویسی کی روایت کا حصہ نہ تھے جہاں دونوں اقوام کے ہیرو ایک دوسرے کے رقیب یا غیر کے طور پر اُبھرتے ہیں اور دونوں اطراف کے ریاستی مؤرخین ایک دوسرے کے اساطین کا نفرت سے بھرپور ایک تشکیلی مرقع تعمیر کرتے ہیں۔

۷۔ ان کے والد ۱۸۵۷ء کے واقعے میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔(۸)

اردو تنقید میں اب ایک غالب رجحان سندھ، بلوچستان، پنجاب، سرائیکی وسیب اور پشتو یا ہندکو کی تاریخ تہذیب اور لوک بیانیہ کے ساتھ قومی شعور یا شناخت کی طلب کا پس منظر دیکھنا چاہیے بے شک قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں یوپی کے اہم شہر اردو زبان و ادب کی تہذیب کے مراکز کے طور پر بطور سند حاوی رہے مگر ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ شاہد احمد دہلوی اور ان کے بعض احباب کے ساتھ نیاز مندانِ پنجاب کے سوال جواب اس روش کا نقش اوّل تھے اور اس میں ترقی پسند ادبی تحریک کے ایک سرخیل ڈاکٹر محمد دین تاثیر پیش پیش

تھے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد نے تو اس حوالے سے خود نیاز مندانِ پنجاب کی پھوٹ کا بھی ذکر کیا ہے جو ڈاکٹر تاثیر کی جارحیت کے سبب پیدا ہوئی واضح رہے کہ تاثیر اور محمد حسن عسکری کی قلمی آویزش کی مثالیں جھلکیاں [عسکری] پیش کرتی ہے، ڈاکٹر آفتاب لکھتے ہیں:

> ''یہ سب چوپٹ کیسے ہوا یہ داستان بھی عجیب وغریب ہے۔ ہوا یہ کہ ''نیاز مندان لاہور'' پہلے تو اپنے حریفان سخن سے علمی ادبی سطحی پر نبرد آزما ہوا کرتے تھے اب کہ آپس ہی میں دست و گریباں ہو گئے۔ بات یہ تھی کہ تاثیر صاحب تھے تو علم وادب کی دنیا کے آدمی مگر ان کو صحافتی سطح پر ہنگامے اٹھانے، لوگوں سے لڑائیاں نکالنے اور چھیڑ چھاڑ کرنے کا بڑا شوق تھا۔ ان صحافتی معرکوں میں تاثیر صاحب اپنے نام کی بجائے اکثر کوئی قلمی نام استعمال کرتے تھے مگر اس سے کیا ہوتا ہے ان کی شوخیٔ تحریر صاف ان کا پتا بتائے دیتی تھی البتہ وہ کبھی اقرار نہیں کرتے تھے مثلاً مجھے یقین تھا کہ ''سول اور ملٹری گزٹ'' میں ڈاکٹر حجازی کے نام سے لکھنے والے تاثیر صاحب ہیں لیکن وہ ہمیشہ مجھے یہ کہہ کر ٹال دیتے تھے کہ یہ ایک شخص کا قلمی نام ہے البتہ وہ شخص میرے پاس آتا جاتا ہے۔ مضمون بھی کبھی کبھی دکھا لیتا ہے آخر ایک دن میرے دوست امجد حسین اور میں نے کہا کہ اچھا تو پھر اس شخص سے ہمیں ملائیے اور انھوں نے ملانے کا وعدہ کر لیا کچھ دنوں کے بعد ہم دونوں کو حجازی سے ملانے کے لیے شام کی چائے پر بلایا وقت مقررہ پر ہم دونوں تاثیر صاحب کے ہاں پہنچے چائے ہوئی۔ حجازی کا ذکر آیا تو اپنے مخصوص شرارت آمیز انداز میں کہنے لگے کہ بھئی وہ آج صبح کی گاڑی سے کہیں باہر چلا گیا ہے اس پر کچھ ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ دوسرے دن کا ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' اٹھا کر دیکھا تو حجازی نے لکھا تھا کہ ''یہ میرا آخری مضمون ہے اب یہ سلسلہ بند ہوتا ہے، کیوں کہ میں ملک سے باہر جا رہا ہوں'' اور اسی دن مجھے معلوم ہوا کہ تاثیر صاحب اسلامیہ کالج کے پرنسپل مقرر کیے گئے ہیں، حجازی کے رخصتی مضمون کی وجہ میری سمجھ میں آگئی!''**(۹)**

ابھی جیسے ذکر کیا گیا کہ سنگت کے مدیر ڈاکٹر شاہ محمد مری ہوں، یا سرائیکی کے رفعت عباس یا پنجابی کے مشتاق صوفی یا سندھی کی نور الہدیٰ شاہ یا امر جلیل وہ اردو ادب پر اہل زبان کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتے، جیسے اکبر لغاری لکھتے ہیں:

''مجموعی طور پر جدیدیت پسندی کا اثر، سندھی ادب پر بہت کم پڑا ہے، جس کی بنیادی وجوہات یہ ہیں۔

۱۔ جن حالات نے جدیدیت پسندی کی تحریک کو جنم دیا، سندھی معاشرہ کبھی اُن حالات سے دوچار نہیں ہوا۔ مثلاً دونوں عالمی جنگوں کے دوران، سندھ پر انگریزوں کی حکومت تھی اور برصغیر میں آزادی کی تحریک چل رہی تھی۔

۲۔ یورپ اور امریکہ میں شائع ہونیوالا ادب، سندھ میں کافی عرصے کے بعد پہنچتا ہے اور اسے پڑھنے والے افراد کی تعداد بہت محدود ہے۔ یہی سبب ہے کہ جدیدیت پسند ادب سندھی ادب پر کوئی تاثر چھوڑنے میں ناکام رہا۔

۳۔ جدیدیت پسندی، اپنے جوہر میں حقیقت نگاری اور عقلیت کے خلاف ہے۔ جب کہ سندھ میں سیاسی فکری اور ادبی ماحول سوشلزم، سماجی حقیقت نگاری اور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر رہا ہے جو کہ اپنی سرشت میں روشن خیال، عقل پسند اور انقلاب کا متمنی تھا اور ہے۔(۱۰)

حوالہ جات:

۱۔ آفتاب احمد، ڈاکٹر، بنامِ مرشدِ نازک خیالاں! فراق صاحب کی خدمت میں چند گزارشات، ص ۵۲:۵۳۔

۲۔ مظفر علی سید، اردو ادب کی صورتِ حال: 'سخن اور اہلِ سخن' (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص ۱۱۔

۳۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، ''مارکس اور موجودہ عالمی بحران: ایک تجزیہ''، مشمولہ: جہات، کراچی، ۲۰۰۴ء۔

۴۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، ''پاکستانی کلچر کا مسئلہ، ادراک، ارتقا''، مشمولہ: مطبوعات، کراچی، ص ۳۲۔

۵۔ سہیل احمد خاں، علامتوں کے سرچشمے، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء)، ص ۱۴۔

۶۔ شمیم حنفی، ڈاکٹر، ادب میں انسان دوستی کا تصور (ایک سیاہ حاشیے کے ساتھ)، ص ۱۱۳۔

۷۔ شمیم حنفی، ڈاکٹر، ادب، ادیب اور معاشرتی تشدد، (ملتان: بیکن بکس، ۲۰۱۵ء، ص ۲۰۶۔

۸۔ قاضی عابد، ڈاکٹر، ''قصصِ ہند: تاریخیت اور نو تاریخیت''، مشمولہ: نو تاریخیت، مرتبہ: ڈاکٹر نسیم عباس احمر، مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۱۹۱:۱۹۰۔

۹۔ آفتاب احمد، ڈاکٹر، ''نیاز مندانِ لاہور اور اُن کا حلقہ ءاثر''، ص ۱۲۸:۱۲۷۔

۱۰۔ اکبر لغاری، ''فلسفیانہ جدیدیت سے ادبی جدیدیت تک، جدیدیت اور سندھی ادب''، ص ۸۷۔